محمد حنیف ندوی

اساسیاتِ اسلام

(۳)

"کیا اساسی نہیں ہے" کی ذیل میں وہ موشگافیاں بھی آتی ہیں جن کا تعلق دین کے بارہ میں مابعد الطبیعی
مسائل سے ہے۔ قرآن حکیم ایک واضح کتاب ہے۔ اس کے اندازِ بیان کی اصلی خوبی ہی یہ ہے کہ اس میں
منطق وقیاس آرائی کی مشکلات پائی نہیں جاتیں۔ اس کا پیغام سیدھا سادا اور سمجھ میں آنے والا ہے
اس کے دلائل کا انحصار سادگی اور وضاحت میں مضمر ہے۔ یہ زندگی کے جس حسین وجمیل نقشہ کو پیش کرتا ہے
اس میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ کوئی پیچیدگی نہیں۔ کہیں بل یا ٹیڑھ نہیں۔ اور تو اور اس میں عقائد کو
بھی اس رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ زندگی کے بنیادی تصورات بھی ہیں اور دلائل و آیات بھی یعنی
شواہد بھی ہیں اور کھلی کھلی اور بین بین حقیقتیں بھی جن سے کہ انسان کا قلب وضمیر نہ صرف اطمینان و
آسودگی حاصل کرتا ہے بلکہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تو وہی جانی بوجھی باتیں ہیں۔ جن سے فطرت و
جبلت کی پرانی آشنائی ہے۔ اور قرآن حکیم کی یہی ادا اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ یہ کتاب فکر و ذہن
کی فطرت نہیں، خیال و عقل کی آفریدہ نہیں بلکہ پروردگارِ عالم کا عطاکردہ تحفہ ہے۔ اس کی ربوبیت
کا کرشمہ اور اس کی عنایتِ بے پایاں کا نتیجہ ہے۔ ہمارے متکلمین پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ انھوں
نے اس حرفِ سادہ کو چیستاں بنا کر رکھ دیا اور جو بات خود بخود دل میں اُتر جانے والی تھی اس کو اس
انداز میں پیش کیا کہ وہ فلسفہ وحکمت کا الجھا ہوا مسئلہ بن گئی۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر ہر دور کی فکری کاوشوں
اور ہر ہر دَور کے علوم وفنون سے فہم و پذیرائی کی سطحیں بدلتی ہیں۔ اور لوگ قدرتاً یہ چاہتے ہیں کہ زمانہ
کے تقاضوں کے مطابق دین کو سمجھنے کی کوششیں جاری رہیں۔ ہم اس چیز کی بھی تردید نہیں کرتے کہ
متکلمین کی ان کوششوں سے انسانی فکر نے بڑی حد تک تابش وضو پائی ہے اور علوم وفنون کی

بوقلمونیوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہم جس دین کو مانتے ہیں اس کا چہرہ روشن، اس کا قدرتی حسن و جمال اور وہ فطری صحت مندی اور توانائی جو اس کی رگ رگ میں جاری وساری ہے، ہر طرح کے مصنوعی غازہ اور پُرتکلف آب و آرائش کی منت پذیریوں سے آزاد ہے

ہمیں جو دینی روشنی ملی ہے اس کا سرچشمہ حضرت ابراہیمؑ کے صحف ہیں۔ حضرت داؤدؑ کا زبور ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی توراۃ ہے۔ حضرت مسیحؑ کی انجیل ہے اور آخر میں ان سب کا نچوڑ ان سب کا عطر اور ان سب کی سچائیوں کا مجموعہ وہ کتاب عزیز ہے اور وہ نسخہ کیمیا ہے جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کیا۔ یہ دینی روشنی ہمیں سقراط، افلاطون، زینو یا ارسطو سے نہیں ملی۔ انبیا علیہم السلام سے ملی ہے اور دونوں کا اسلوب معرفت دونوں کے ذرائع علم اور دونوں کے نتائج اور اک قطعی مختلف ہیں۔

حکما کے علم و معرفت کی بنیاد فکر و تعقل کی تگ و تاز پر ہے اور انبیا کا علم و ادراک وحی و تنزیل کی یقین افروزیوں پر۔ علم الکلام یا مابعد الطبیعی موشگافیوں کو اس بنا پر بھی ہم دین کی اساس قرار نہیں دے سکتے کہ ان میں کہیں بھی اتفاق رائے پایا نہیں جاتا۔ کیونکہ یہ متعدد نقطہ ہائے نگاہ پر مبنی ہیں ان کا اسلوب اور طریق استدلال بھی ایک دوسرے سے جداگانہ ہے اور نتائج بھی ایک جیسے نہیں اور اتفاق رائے کا پایا جانا ممکن ہی کب ہے؟ جب کہ سب کی راہیں الگ الگ ہیں۔ آخر وہ شخص جو اپنے علم و ادراک کو صرف تجربہ و مشاہدہ کی تنگنائے تک محدود رکھنا چاہتا ہے، کائنات کی حقیقت کے بارہ میں کیا کہہ سکتا ہے۔ روح کے متعلق کن حقایق کا انکشاف کر سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ احوال آخرت، اور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات میں تعلق و ربط کا جو اشکال پوشیدہ ہے اس کو کیونکر فہم و فکر کی گرفت میں لا سکتا ہے جب کہ یہ ساری باتیں مدلولات (DATA) کے اس دائرہ سے خارج ہیں کہ جن پر اس کے قصر استدلال کی بنیاد ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو اس مدرسہ فکر کا حامی ہے، جس کو ہم فلسفہ کی اصطلاح میں تصوریت (IDEALISM) کہتے ہیں۔ حقیقت سے متعلق جچی تلی صاف اور متفق علیہ رائے کا اظہار کیوں کر سکتا ہے۔ جب کہ افلاطون سے ہیگل تک تعبیر و تشریح کے متعدد پیمانے پائے جاتے ہیں اور کسی ایک نکتہ پر بھی ان میں فکر و خیال کی ہم آہنگی موجود نہیں۔ علاوہ ازیں ان کا علم خود اپنا اور مستقل بالذات بھی نہیں۔ بلکہ

اس کا تعلق دوسرے علوم و تجربات اور علم و ادراک کی دوسری شاخوں سے ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو تشکیک (SCEPTICISM) کا شکار ہے یقین و اذعان کے ساتھ کسی بھی حقیقت کے بارہ میں کیونکر لب کشائی کی جرأت کر سکتا ہے، چہ جائیکہ اس سے اس بات کی توقع رکھی جائے کہ وہ دین کے فائق تر اور لطیف تر حقائق کے بارہ میں کوئی ایمان افروز بات کہہ سکنے کا مجاز ہے۔ انسانی علم و ادراک کی پوری تاریخ پر نظر ڈال جائیے اور بتائیے کہ ان تین مدارس فکر کے علاوہ کوئی چوتھا ذریعہ علم بھی پایا جاتا ہے کہ جس سے اس سلسلہ میں استفادہ کیا جا سکے اور جب ان تینوں کی واماندگی و ضعف کا یہ عالم ہے تو یہ کس حد تک مناسب ہوگا کہ دینی عقائد یا ایمانیات کو ان موشگافیوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے جو خود روشنی سے محروم ہیں اور یقین و آگہی کی بھیک ان لوگوں سے طلب کی جائے جن کا دامن خود اس نعمت سے تہی ہے۔

متکلمانہ موشگافیاں علاوہ اس حقیقت کے کہ ایمان و حتمیت کے تقاضوں کو اُکسانے میں ناکام رہتی ہیں اور قطع نظر اس بات کے کہ دلیل و حجت کی خنکیاں، دلوں میں اس حرارت و تپش کو پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں جو ایمان کا ضروری جزء ہے اور جس سے کہ ایک شخص سرگرم عمل ہوتا ہے، اخلاص و صدق کا اظہار کرتا ہے ایثار و قربانی سے کام لیتا ہے اور ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے کہ عقل جنھیں دیکھ کر دنگ و ششدر رہ جاتی ہے ان میں مضرت کا سب سے بڑا اور خطرناک پہلو یہ پوشیدہ ہے کہ اس سے دعوتِ دینی کا مزاج ہی بدل جاتا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ فکر و نظر کی جنبشیں زندگی کے عملی گوشوں کی طرف سرکیں۔ ان مابعد الطبیعی بحثوں کی بدولت ان کا مرکز ثقل ایسی لاطائل، بے کار اور لغو بحثوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جن کو کسی درجہ میں بھی دین نہیں کہا جا سکتا۔ ان ضروری موشگافیوں سے کسی دین کا حلیہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور کیونکر ایک اچھی خاصی دعوت مضحکہ خیز شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو کلیسا کی تاریخ پڑھیے۔ جہاں تک حضرت مسیح کے پیغام کا تعلق ہے وہ کتنا سادہ، کتنا پیارا اور کس درجہ معقول اور متوازن ہے۔ وہ صرف اس بات کی تلقین کرنا چاہتے ہیں کہ انسانیت ایک ہے۔ سب انسانوں سے محبت اور شفقت کا سلوک ہونا چاہیے۔ سب کے کام آنا چاہیئے۔ سب کی خدمت بجالانا چاہیئے۔ دین و شریعت کے بارہ میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ

فقیہانہ سختیوں کا متمن نہیں۔ اس میں اونچ نیچ اور یہودیانہ حیل کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس کا اطلاق امیر و غریب پر یکساں ہونا چاہیئے۔ دین کا مفہوم یہ نہ ہونا چاہیئے کہ اگر اس کی زد امراء پر پڑتی ہو تو اسے عملاً معطل رکھا جائے اور اگر کوئی غریب سزا اور عقوبت کا مستحق قرار پاتا ہو تو مدعیانِ دین کی پوری مشینری فوراً حرکت میں آجائے۔ حضرت مسیح کا مشن دراصل یہ تھا کہ وہ دلوں میں اللہ کی محبت کے چراغ روشن کریں اور انسانیت کے لیے شفقت اور اخلاص کا ایسا جاں نواز ماحول معرضِ وجود میں لائیں جہاں مہر و وفا اور حسنِ سلوک کے سوا کچھ نہ ہو۔ جہاں تمام لوگ رنگ و قوم کے اختلافات کے باوجود اپنے کو ایک ہی کنبہ کے ذمہ دار افراد تسلیم کریں۔ ان کے پیغام کی غرض و غایت یہ بھی تھی کہ یہودیوں کی جھوٹی مذہبیت کو بے نقاب کیا جائے اور صاف صاف لفظوں میں بتایا جائے کہ ان کے پاس دین کے نام سے جو عظیم اور ضخیم ذخیرہ پایا جاتا ہے اس میں بلاشبہ قانون کی بے جا سختیاں ہیں۔ شریعت و فقہ کی شاخ در شاخ تفصیلات ہیں۔ حلال و حرام کی غیر ضروری بحثیں ہیں لیکن اس میں وہ حرفِ الفت نہیں۔ انسانیت کے لیے درد اور تڑپ نہیں۔ روح کی وہ لطافتیں نہیں کہ جنھیں ایمان اور دین کی جان کہہ سکتے ہیں۔

اس مسلک کی پاکیزگی اور بلندی دیکھیے اور یہ دیکھیے کہ کلیسا کے متکلمین اس عیسائیت کو مسخ کر کے کس نئے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ اس نئے روپ کے خد و خال یہ ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ تین مستقل اقانیم سے تعبیر ہے۔ یعنی وہ بیک وقت باپ بھی ہے اور بیٹا بھی، بیٹا بھی ہے اور روح القدس بھی۔ اور پھر یہ اقانیم تین نہیں ایک ہیں۔ فرمائیے یہ ریاضی عام تو عام کسی خاص ذہن کے لیے بھی قابلِ قبول ہو سکتی ہے؟ یا یہ فرمائیے کہ ان کی اس منطق میں معقولیت سے قطع نظر کوئی پیغام پایا جاتا ہے؟ دعوت کا کوئی پہلو موجود ہے؟ زندگی، عمل اور کردار کو سنوارنے اور چمکانے کا کوئی سامان مہیا ہے؟

حضرت مسیح کے تین سو سال بعد یہ متکلمانہ موشگافیاں جنگ و جدل کی ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ ارباب کلیسا کو نائسیا (NICAEA) کے مقام پر باقاعدہ ایک مجلس مناظرہ ترتیب دینا پڑتی ہے۔ اس میں جو مسائل زیرِ بحث آئے وہ یہ تھے کہ حضرت مسیح کے جسم اور جوہرِ الوہیت میں رشتہ و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اور دونوں میں غلبہ کس کا ہے؟ کیا یہ دونوں الگ ہیں۔ اگر ایک

ایک ہی تو صلیب پر کون چڑھا اور کس نے موت کا پیالہ پیا؟ کیا جسم نے؟ اگر جسم نے اذیتیں برداشت کی ہیں تو پھر یہ اذیتیں پوری نوع انسانی کے لیے کفارہ کیوں کر ثابت ہوئیں اور اگر ان اذیتوں کا ہدف وہ اقنوم ہے جس کو الوہیت سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس صورت میں اس اقنوم کو خدا قرار دینا کس منطق کی رُو سے جائز ہوگا۔ اس مسئلہ پر اُن میں دو رائیں ہوگئیں۔ آریوس (ARIUS) کے حامیوں نے مسیح میں دو متخالف عناصر کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا۔ رائے عامہ نے اتھینا سیس (ATHANSIUS) کی تائید کی اور ان لوگوں کو عیسائیت سے خارج کر دیا گیا جنھوں نے اس خلاف عقل عقیدہ کے سامنے سر نیاز خم نہ کیا۔ مسیح کے تین سو سال بعد عیسائیت کی جو عقلی موشگافیوں کی بدولت تعبیر نو ہوئی اس کا رُخ انسان دوستی، ایمان اور محبت وخیر سگالی ایسے اوصافِ حمیدہ سے ہٹ کر ایسے لاطائل مسائل کی طرف مڑ گیا جن کا اصل عیسائیت سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا اور اس طرح وہ دین جو یہودیت کو الفاظ پرستی قانون کی سختی اور فقہ وشریعت کی شاخ در شاخ اور بے روح تفصیلات سے نجات دلانے کی غرض سے آیا تھا خود عقائد کے بے جان گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گیا۔

اسلام کی فکری وعلمی تاریخ میں مابعد الطبیعی مسائل کی اہمیت نے بھی قریب یہی کردار ادا کیا: وہ اسلام جو انسانیت کو معراج کمال تک پہنچانے کے لیے آیا تھا - معاشرہ کی تہذیبی وتمدنی چمن بندی جس کا نصب العین تھا - جو اللہ سے روٹھے ہوئے دلوں میں رجوع الی اللہ کے داعیوں کو ابھارنے اور تقویٰ ومحبت الٰہی کی فراوانیوں کی پرورش کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ متکلمانہ مساعی سے قیل وقال، بحث ومناظرہ، اور فضول قسم کی منطق آرائی میں اُلجھ کر رہ گیا۔

بھلا ان مسائل کو دین سے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات، قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق، اللہ تعالیٰ کا علم جزئیات کو گھیرے ہوئے ہے یا نہیں۔ اس کی قدرت کے دائرے اس حد تک وسعت پذیر ہیں یا نہیں کہ اس میں معصیت بھی داخل ہو محالات کی بھی گنجائش نکل سکے۔ ارادہ کی ماہیت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کن معنوں میں مرید یا ارادہ کناں ہے۔ اس کا ارادہ بدلتا رہتا ہے یا ازلی نوعیت کا حامل ہے۔ بدلتا رہتا ہے تو ازلی کیونکر ہوا۔ اور اگر ازلی ہے تو اس میں تجدید وتغیر کیسے آئے گا ہمیں اسی طرح کی بیسیوں موشگافیوں نے صدیوں تک اسلامی ذہن وفکر کو الجھائے

رکھا۔ آخر آخر میں اس بحث نے ہمارے ہاں ادب و تصوّف کے حلقوں کو بڑی حد تک متاثر کیے رکھا کہ وجود کی ماہیت کیا ہے۔ ربِ کائنات اور اس ساری کائنات میں وجود مشترک ہے، یا اللہ تعالیٰ اور مخلوق کی فطرتِ وجود جدا جدا ہے۔ اول الذکر رجحان نے وحدت الوجود کے فلسفہ کی حیثیت سے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بحیثیت مجموعی اسلامی معاشرہ غیر ضروری اور غیر صحت مند مسائل میں الجھ جانے کی وجہ سے دین کی اس کلی روح سے بے گانہ ہو گیا کہ جس کا مقصد پورے نظامِ حیات کی اصلاح و ترقی تھا۔ خدا بھلا کرے امام احمد بن حنبل کا، علامہ ابوالحسن اشعری کا، غزالی اور ابن تیمیہ کا، شاہ ولی اللہ اور مجدد الف ثانی کا، کہ جن کی علمی و عملی مساعی سے احیاء و تجدید دین کے تقاضوں کو پھر سے زندگی ملی۔ اور دین نے فلسفہ و کلام کی فتنہ سامانیوں سے مخلصی حاصل کی اور پھر اس اصلی رُوپ میں جلوہ گر ہوا جس کی تابانیوں نے پورے عالم انسانی کو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ (باقی آئندہ)

مسلمانوں کے عقائد و افکار

(از علامہ ابوالحسن اشعری، ترجمہ مولانا محمد حنیف ندوی)

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے جلیل القدر عالم علامہ ابوالحسن اشعری کے شاہکار "مقالات الاسلامیین" کا ترجمہ ہے اس میں علامہ نے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے ان تمام عقائد و افکار کو بغیر کسی تعصب کے بیان کر دیا ہے جو صدیوں ہمارے ہاں فکری و کلامی مناظروں کا محور بنے رہے۔ اس کے مطالعے سے جہاں یہ معلوم ہو گا کہ مسلمانوں نے نفسیات، اخلاق اور مادہ و روح کے بارے میں کن کن علمی جواہر پاروں کی تخلیق کی ہے۔ وہاں یہ حقیقت بھی نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ماضی میں فکر و نظر کی کجی نے کن کن گمراہیوں کو جنم دیا ہے اور ان گمراہیوں کے مقابلے میں اسلام نے کس معجزانہ انداز سے اپنے وجود کو برقرار رکھا ہے۔ قیمت: ۹ روپے

ملنے کا پتہ

سکریٹری ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور